Fikr-o-Nasar (Islamabad) 4:1-2 (1966)

جہاد کا قرآنی تصوّر

پروفیسر محمّد عثمان

جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے اور لُغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں اور قرآن و سنت سے اس کی کم از کم چار قسمیں ثابت ہیں۔ (۱) نفس کی سرکش قوتوں کے خلاف جہاد جسے رسول کریمؐ نے جہاد اکبر سے تعبیر فرمایا ہے۔

(۲) علم کے ساتھ جہاد جسے اصطلاح مذہبی میں جہاد بالقرآن کہتے ہیں۔ اور قرآن نے اسے جہاد کبیر بتایا ہے۔

(۳) مال کے ساتھ جہاد جس کا مطلب راہِ حق میں زر و مال خرچ کرنا ہے اور قرآن حکیم میں اس پر جا بجا زور دیا گیا ہے۔

(۴) جان کے ساتھ جہاد یعنی حق کی راہ میں جسمانی تکلیفیں اٹھانا اور جان کی پیش کش کرنا قرآن اسے قتال فی سبیل اللہ، اللہ کی خاطر لڑنا اور جنگ کرنا کہتا ہے۔ اس تشریح سے واضح ہے کہ راہِ حق میں لڑنا جہاد کی فقط ایک صورت ہے مگر صدیوں سے اسی جنگ کے لئے جہاد کا وسیع تر اور جامع لفظ کچھ اس طرح سے مقبول اور رائج ہے کہ اب اس کا استعمال ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ زیر نظر مضمون میں اگرچہ بحث مطلق جہاد سے نہیں بلکہ محض قتال سے ہے۔ مگر قارئین کی آسانی کے لئے لفظ جہاد ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

جہاد کی فرضیت اور جہاد کا قرآنی تصور اسلامی تعلیمات کا ایک ایسا روشن پہلو ہے کہ اس کے جاننے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں کم سے کم دقّت پیش آنی چاہیئے تھی۔ مگر اس راہ میں اپنوں اور غیروں نے اس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں کہ اسے تاریخ اسلام کا ایک المیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دانستہ ٹھوکریں کھانے -

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.
http://iri.iiu.edu.pk/

والوں سے قطع نظر، جو لوگ خلوصِ نیت کے باوجود اس مسئلے کی حقیقت تک پہنچنے سے قاصر رہے ہیں۔ اُن کی لغزشِ فہم کے دو اسباب تشخیص ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ علمائے سلف نے اپنے مخصوص حالات کے پیشِ نظر اس باب میں جو اجتہاد کیا اور مسلمان کشور کشاؤں نے ملک گیری اور اشاعتِ اسلام کے ملے جلے جذبات کے تحت جو راہِ عمل اختیار کی بعد میں آنے والی نسلوں نے اپنی کوتاہ نظری کے باعث اس کو اسلام کا جزو لاینفک سمجھ لیا۔ دوم یہ کہ اس اہم مگر نازک مسئلہ کے متعلق قرآنی آیات کا مفہوم متعیّن کرتے وقت ان کا تاریخی پس منظر یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ حالانکہ پس منظر کو سامنے رکھے بغیر ان آیات کا صحت کے ساتھ سمجھنا سمجھانا ایک امرِ محال ہے۔ لہٰذا میں سب سے پہلے اس پس منظر اور ماحول کو بیان کرتا ہوں، جس میں ہم پر جہاد فرض کیا گیا۔

جہاد کی فرضیت کا پس منظر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکّہ کے لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلایا اور انہیں بُت پرستی سے منع کیا تو یہ دعوت ان کو بڑی ناگوار گزری۔ اوّل تو یہی بات ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ جس طریقِ زندگی کو ان کے باپ دادا نے برتا تھا۔ اسے وہ کیونکر چھوڑ دیں۔ ایسا کرنا گویا اس امر کا اعتراف کرنا تھا کہ ان کے بزرگ گمراہ اور حقیقت سے بے بہرہ تھے اور یہ صورت انہیں کسی طرح گوارا نہ تھی۔ دوسرے ان کے ہاں خاندانی اور قبائلی رقابتوں کا سلسلہ بڑی دور تک چلتا تھا اور ایک خاندان یا قبیلے کے لئے کسی دوسرے خاندان یا قبیلے کی سرداری قبول کر لینا ان کی فطرت کے سراسر خلاف تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں انہیں آلِ ہاشم کی برتری کا خدشہ نظر آتا تھا۔ ان کی مخالفت کے بعض معاشی اور عمرانی اسباب بھی تھے مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم خدا کی وحدت اور انسانوں کی مساوات کا سبق دیتی تھی۔ انسان ہونے کی حیثیت سے امیر اور غریب، آقا اور غلام، قریشی اور غیر قریشی، مکّی اور مدنی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ اس سے مکّہ کے متموّل اور معزز گھرانوں کے احساسِ برتری کو ٹھیس لگتی تھی۔ اور ان کی خاندانی وجاہت کو صدمہ پہنچتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قریش کے سرداروں کو اس دعوت کی اوٹ سے معاشی بدحالی جھانکتی دکھائی دیتی تھی۔ کعبہ ملک کا سب سے بڑا بت کدہ تھا۔ اور حج کے دنوں میں ہر سال زائرین ہزاروں کی تعداد میں مکہ کے کھلے میدانوں میں جمع ہوتے اور سال بھر کا اندوختہ ساتھ لاتے تھے۔ اس میں ایک حصّہ تو "خداؤں" کی نذر ہو جاتا اور باقی سے وہ خرید و فروخت کرتے اور خوب دادِ عیش

دیتے تھے۔ خداؤں کے متولی بھی قریش تھے اور بازاروں اور منڈیوں کے مالک بھی قریش۔ اس طرح بتانِ کعبہ کی بدولت ملک بھر کی دولت ہر سال ان کی جھولیوں میں پڑتی تھی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بت پرستی کے خلاف آواز اٹھائی تو دور اندیش قریش نے ایسا محسوس کیا جیسے ان کی عمارتِ تمول میں زلزلہ آ گیا ہو۔

ان چند در چند وجوہ کی بناء پر مکّہ کے سرداروں نے شروع ہی سے رسول اکرمؐ کی دعوت سے اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا تھا۔ مگر جب آپؐ نے اُن کی ناراضی کے باوجود حکمت و استقلال سے کام لے کر کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا تو مخالفین کی سرگرمیاں بھی تیز ہو گئیں۔ اب جوں جوں اسلام کا قدم آگے بڑھتا گیا، سردارانِ قریش کی مخالفت سخت سے سخت تر ہوتی گئی۔ پہلے صرف زبان سے کام لیا جاتا تھا۔ اب ہاتھ اٹھنے لگے تھے۔ غریب اور کمزور مسلمانوں کو طرح طرح سے تنگ کیا جانے لگا۔ مسلمان غلاموں کو ان کے کافر آقا گرم ریت پر لٹا دیتے اور بہانے بہانے سے ان پر کوڑے برساتے تھے۔ اس تشدد کے باوجود مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ کفّار کے غم و غصّہ میں اور اضافہ ہو گیا۔ اب اٹھے ہوئے ہاتھوں میں تلوار کھنچ آئی۔ اور کچھ مسلمانوں کو جن میں ایک خاتون بھی شامل تھیں، شہید کر دیا گیا۔ اس سے غرض عوام میں خوف و ہراس پھیلانا تھا تاکہ وہ انجام سے ڈر کر نئے دین میں داخل نہ ہوں مگر رسول اکرمؐ اور آپؐ کے ساتھی ان مہیب مصائب کے درمیان کوہِ وقار اور پیکرِ عزم و استقلال بنے اپنی منزل کی طرف بڑھتے گئے۔ وہ بڑے سے بڑے دشمن کی بات بھی توجہ اور بُردباری سے سنتے اور اپنی بات محبّت اور نرمی سے اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش یہ تھی کہ مکّہ کا ماحول ایسا ہو جائے کہ اس میں ہر شخص کو خیال اور عقیدے کی آزادی حاصل ہو۔ جو بُت پرست رہنا چاہے وہ بُت پرست رہے، مگر جو خدا پرست بننا چاہے، اس کو بھی ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ مخالفین مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے، وہ ہر شخص کو فقط بت پرست دیکھنا چاہتے تھے۔

ایک امن پسندانہ مگر انقلابی اقدام

توحید پرستوں پر مشقِ ستم جاری رہی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آبرومندانہ زندگی کی کوئی راہ نہ دیکھ کر ایک انقلابی مگر نہایت امن پسندانہ قدم اٹھایا۔ آپؐ نے کچھ مسلمانوں کو وطن چھوڑ کر ملک حبشہ چلے جانے اور وہاں بس جانے کا مشورہ دیا۔ اس تدبیر پر اس طرح عمل کیا گیا کہ کفّار کو کانوں کان

کئے ہیں، مجمل طور پر درج ہیں۔ مسلمانوں کو لڑائی کی اجازت اس لئے دی جارہی ہے کہ ان سے "لڑائی کی جاتی ہے" اور ان پر ظلم ہوچکا ہے۔ انہیں محض اس لئے جلاوطن کیا گیا ہے کہ انھوں نے بتوں کے آگے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور وہ خدائے واحد کو اپنا پروردگار مانتے ہیں۔ اس اجازت اور اذن کی مزید وضاحت ہمیں مندرجہ ذیل آیات میں ملتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ "اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ اور جہاں سے تم کو نکالا ہے، وہاں سے تم ان کو نکال دو۔ اور دین کے لئے دکھ دینا قتل سے زیادہ سخت ہے اور جب تک کافر تم سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑیں تم بھی ان سے اس جگہ مت لڑو۔ اور اگر تم سے لڑیں تو تم بھی ان کو قتل کرو۔ کافر اسی کے سزاوار ہیں۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے تم ان سے لڑائی جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ ہاں اگر وہ جنگ سے رک جائیں تو ظلم کرنے والوں کے سوا کسی پر سختی نہ ہونی چاہیئے۔ حرمت والے مہینے کا عوض حرمت والا مہینہ ہے اور تمام حرمتوں کے بدلے ہیں۔ پس جو تم پر زیادتی کرے، اس پر تم بھی اتنی ہی زیادتی کرو اور اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ اللہ انہی کا ساتھی ہے جو اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔ (البقرہ : ۱۹۰ : ۱۹۴)

یہاں بھی وہی پس منظر ہے۔ مسلمانوں کو ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو ان سے جنگ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک کرنے کی ہدایت ہے۔ جو وہ مسلمانوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ حکم ہوتا ہے، ان کو ان گھروں سے نکال دیا جائے، جہاں سے انھوں نے مسلمانوں کو نکالا تھا۔ اور اگر وہ حرمت کے مہینوں میں بھی لڑیں تو ان سے لڑائی جاری رکھی جائے۔ لیکن اس کیساتھ یہ انتباہ بھی ہے کہ زیادتی مت کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ لہذا اگر وہ لڑائی سے باز آجائیں تو مسلمانوں کو بھی جنگ بند کر دینی چاہیئے اور جنگ کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ پردازی باقی نہ رہے اور ملک میں امن و انصاف کی ایسی فضا قائم ہو جائے کہ جو شخص، جو دین اختیار کرنا چاہے اسے بے کھٹکے اختیار کر سکے۔ اکثر مفسرین نے یہاں فتنہ کے معنی دین سے برگشتہ کرنے کے لئے تشدد برتنا اور اللہ کے لئے دین کے معنی مذہبی آزادی کے بیان کئے ہیں۔

کفّارِ مکّہ کے علاوہ رسول اکرمؐ کو مدینہ کے یہود اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کے خلاف بھی جنگ کرنا پڑی۔ مگر ان جنگوں کی نوعیت بدر اور اُحد سے کچھ بھی مختلف نہ تھی۔ رسول اکرمؐ نے مدینہ پہنچتے ہی وہاں کے یہود سے اور آس پاس کے چند ممتاز عرب قبائل سے جو ہنوز دائرۂ اسلام سے باہر تھے، دوستی کے معاہدے کئے۔ یہودیوں سے یہ طے پایا کہ اگر کوئی طاقت مدینہ پر حملہ آور ہو تو وہ رسول اکرمؐ کی قیادت میں شہر کی حفاظت کریں گے اور دشمنوں کی مدد نہ کریں گے۔ اسی طرح بعض قبائل سے جنگ کی صورت میں ایک دوسرے کی امداد کا معاہدہ کیا گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ جہاں مسلمانوں نے ان معاہدوں کا سختی کے ساتھ احترام کیا، وہاں مدینہ کے یہود اور بعض مشرک قبائل نے ان کی بار بار خلاف ورزی کی اور عین جنگ کے موقعوں پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر دشمنوں کی اعانت کے مرتکب ہوئے۔ دشمن کے حلیف و مددگار کو دشمن قرار دینا ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ جیسے جیسے یہ عہد شکنی اور دغابازی معرضِ عمل میں آتی گئی، مسلمانوں کو ان بدعہدوں اور فریب کاروں کے خلاف بھی جنگ کرنے کا حکم دیا گیا۔ دراصل یہ لوگ اسلام دشمنی اور فتنہ انگیزی میں قریشِ مکّہ سے کچھ کم نہ تھے۔ اور ہر اُس جنگ میں شریک ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے، جس کی غرض اسلام کو نیست و نابود کرنا اور مسلمانوں کی ہستی کو فنا کرنا ہوتا تھا۔ اس بناء پر ان کے خلاف جہاد کی نوعیت قریب قریب وہی تھی، جو کفّارِ مکّہ کے خلاف جہاد کی تھی۔ یعنی شر و فساد اور جنگی سرگرمیوں کا آغاز ان کی طرف سے ہوا مسلمانوں کی طرف سے جہاد اُس کے جواب میں کیا گیا۔ یہی حال غزوۂ خیبر اور غزوۂ تبوک کا تھا۔ جب اس امر کی تصدیق ہو چکی کہ کوئی طاقت مدینہ پر حملے کی تیاریاں کر رہی ہے تو اس کے شر سے بچنے کے لئے آپؐ نے فوج کشی کا حکم دیا۔

جہاد ابدی اعلانِ جنگ نہیں ہے۔

کیا جہاد کا حکم کفّار اور مشرکین کے خلاف ابدی اعلانِ جنگ نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن حکیم نے خود بڑے اہتمام سے دیا ہے اور واشگاف لفظوں میں بتایا ہے کہ جنگ و قتال کا حکم مطلق اور ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ محض اور فقط ان لوگوں کے خلاف ہے، جو مذہبی آزادی سلب کرنے کی کوشش کریں اور اختلافِ عقیدہ کی بناء پر مسلمانوں کے خلاف جارحانہ عزائم رکھتے ہوں۔ مگر جو لوگ ایسا نہیں کرتے، مسلمانوں کی زندگی میں مخل نہیں ہوتے اور اُن کی آزادی کے لئے خطرے

کا موجب نہیں بنتے، ان کے ساتھ بلا امتیازِ عقیدہ و مسلک حُسنِ سلوک کرنے اور پُر امن طریق سے رہنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

" اللہ تم کو ان کفّار یا مشرکین کے ساتھ مروّت و احسان کرنے سے منع نہیں کرتا، جو دین کے معاملے میں تم سے لڑتے نہیں اور انھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ بے شک اللہ انصاف پسند لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔" (۶۰ : ۸)

ظلم و شر اور فتنہ و فساد کے خلاف جنگ ضروری ہے۔

قرآن حکیم میں جہاد کا حکم اور اس کے متعلقات کا بیان کئی جگہ پر ہے۔ ان سب کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو جو بات قطعی طور سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاد ایک ایسی جنگی کارروائی ہے۔ جو فقط ظلم و شر، مکر و فریب اور فتنہ و فساد ہی کے جواب میں یا اس کے پیشِ نظر کی جاتی ہے۔ جہاد از خود عمل میں نہیں آتا۔ اس کی فرضیت اور اس کا جواز صرف اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب مسلمانوں کے انسانی حقوق غصب کئے جائیں یا کئے جانے والے ہوں۔ جب ان کے ساتھ ظلم و ناانصافی ہوئی ہو، ان کے وجود و سالمیت کو کوئی خطرہ لاحق ہو، جب کوئی طاقت ان کی ہستی کو چیلنج کر رہی ہو۔

اس کے علاوہ فقط ایک صورت میں لڑنے یا قوت استعمال کرنے کی قرآن حکیم نے اور تلقین فرمائی ہے اور اس کا تعلق مسلمانوں کی آپس کی صلح و جنگ سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

" اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ پھر ان میں سے اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے، اس سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے پس جب وہ رجوع کرے تو ان دونوں میں برابری کے ساتھ صلح کرا دو، اور تم انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔" (۴۹ : ۹) (الحجرات : ۹)

مذکورہ بالا آیت کا حوالہ دیتے ہوئے علّامہ اقبال مرحوم اپنے ایک خط میں بڑی قطعیت کے ساتھ لکھتے ہیں :

" قرآن کی تعلیم کی رُو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جبکہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے مسلمانوں

کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم) دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے ۹ : ۴۹ میں بیان ہوئی ہے۔

جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا دین اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے (اقبال نامہ حصہ اوّل ۲۰۳ - ۲۰۴)

متذکرہ آیت (۹ : ۴۹) جیساکہ آپ اوپر دیکھ آئے ہیں۔ دراصل مسلمانوں کے باہمی نزاع و اختلاف سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اگرچہ اس میں زیادتی کرنے والے مومن گروہ کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ تاہم یہ معاملہ خالصتاً مسلمانوں کا اندرونی مسئلہ ہے۔ اور قرآن نے اسے قتال فی سبیل اللہ (اللہ کی راہ میں لڑنے) کا نام دیا۔ اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ آیت بھی جہاد کے کڑے اصطلاحی معنوں کی حدود سے خارج ہے۔ کیونکہ اساسی طور سے جہاد غیر مسلموں کے خلاف جنگی کارروائی کا نام ہے اور قرآن حکیم نے ہر جگہ کفّار و مشرکین ہی کی نسبت سے اسے بیان کیا ہے۔

جہاد اور سنّتِ رسول صلعم

قرآن حکیم کے بعد سنت رسول اللہؐ کا مطالعہ کیجئے۔ یہاں بھی یہ امر قطعی طور سے ثابت ہے کہ جہاد فقط آمادۂ شر و تشدّد کفّار و مشرکین کے خلاف ہی کیا گیا۔ کسی امن پسند قبیلے کے خلاف خواہ اس کا عقیدہ و مسلک کچھ ہی تھا، جہاد کرنے کا سوال کبھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس ضمن میں حضرت خالدؓ بن ولید سے جو ایک مرتبہ چوک ہوئی اس کا ذکر اور اس پر رسول اکرمؐ کا اظہارِ ناراضی و بے تعلقی احادیث کی کتابوں میں بہ تفصیل موجود ہے۔ مولانا شبلی اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"فتح مکّہ کے بعد جب آنحضرتؐ نے حضرت خالدؓ بن ولد کو بنو قذیمہ کی طرف بھیجا تو صاف فرما دیا کہ صرف دعوتِ اسلام مقصود ہے، لڑائی مقصود نہیں۔ چنانچہ ابن سعد لکھتے ہیں :-

(ترجمہ) آنحضرتؐ نے خالدؓ کو بنو قذیمہ کی طرف بھیجا دعوتِ اسلام کے لئے نہ کہ لڑائی کے لئے

علّامہ طبری اس موقع پر لکھتے ہیں :-

آنحضرتؐ نے مکّہ کے اطراف میں سرایا بھیجے دعوت اسلام کے لئے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا۔

باوجود اس کے حضرت خالدؓ نے تلوار سے کام لیا اور آنحضرتؐ نے سُنا تو آپؐ کھڑے ہو گئے اور قبلہ رُو ہو کر کہا :-

اے خدا ! خالدؓ نے جو کچھ کیا ہے ، میں اس سے بری ہوں ۔ تین دفعہ اسی طرح یہ الفاظ فرمائے پھر حضرت علیؓ کو بھیجا ، جنہوں نے ایک ایک بچّہ کا یہاں تک کہ جانوروں تک کا خون بہا ادا کیا اور اس پر مزید رقم دی ۔ (سیرت النبی حصّہ اوّل ص ۶۰۵)

مصر کے سابق وزیر تعلیم اور مشہور عالم محمّد حسین ہیکل اپنی شہرۂ آفاق کتاب " حیاتِ محمدؐ " میں اس واقعہ کے ضمن میں حضرت خالدؓ کی بے جا لشکر کشی کا بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

رسول اللہؐ نے سُنا تو فرطِ غم سے بے قرار ہو گئے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر حضور خداوندی میں التجا کی ۔

اللھُمّ اِنّی ابراءُ من ماضنع خالد بن ولید (یا اللہ ! خالد بن ولید کی اس حرکت سے میں بری الذمّہ ہوں) اور حضرت علیؓ کو بہت سا مال و زر دے کر مظلومین کی طرف بھیجا تاکہ ان کی تعداد کے مطابق دیت (یعنی خون بہا) ادا کی جائے ۔ اور جناب علیؓ کو تاکید فرمادی کہ جان و مال کے نقصان کی تلافی جاہلیت کے زمانہ سے کہیں فراخدلی سے کی جائے ۔

حضرت علیؓ نے فراخدلی کے ساتھ دیت اور اموال کا تاوان ادا کیا اور ادائے دیت کے بعد جو رقم بچی وہ احتیاطاً انہیں عطا فرمادی تاکہ اگر کسی کے ضیاع کا انکشاف ہو تو اس کی بھی تلافی ہو جائے ۔"

(اردو ترجمہ حیاتِ محمدؐ ، ص : ۹۰۲)

جہاد ایک اصولی جنگ ہے

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن و سنّت کی روشنی میں جہاد ایک اصولی جنگ ہے جس کے جواز کو دنیا کا کوئی انسان چیلنج نہیں کر سکتا ، جو زندگی کے تحفظ ، عقیدہ و خیال کی آزادی اور شر و فساد کی روک تھام کے لئے لڑی جاتی ہے تو پھر صدیوں سے غیر مذاہب والے کیوں جہاد کا نام لے کر مسلمانوں کو ایک خونخوار قوم اور اسلام کو ایک وحشی مذہب سمجھتے اور قرار دیتے چلے آرہے ہیں ؟

اس کی دو وجوہ ہیں ، جن کا ہم نے مضمون کے شروع میں مختصراً ذکر کیا تھا اور اب ان کو قدرے تفصیل سے بیان کرنے کا مناسب موقع ہے ۔

جیسا کہ آپ دیکھ آئے ہیں، رسول اکرمؐ نے کم و بیش چودہ پندرہ برس تک انتہائی شدائد کے درمیان اشاعت توحید کا فریضہ انجام دیا اور جب ایک بستی (مدینہ) اسلام کا گھر قرار پا چکی اور اس میں بسنے والوں کی بھاری اکثریت نے بخوشی اسلام قبول کر کے اپنی زندگی و موت کو اس کے ساتھ وابستہ کر دیا تب بھی کفار اپنے جابرانہ عزائم سے باز نہ آئے تو پھر مسلمانوں کو اپنی زندگی کی حفاظت میں پہلے جنگ (جہاد) کی اجازت اور پھر اس کا حکم دیا گیا۔ اور ظلم و زیادتی کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرنے کے بجائے قوت کے ساتھ اس کا جواب دینے کا اصول مسلمانوں کی زندگی کا ضابطہ قرار پایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب اسلام محض ایک عقیدہ اور ایک نظریۂ حیات نہیں رہا تھا، بلکہ مسلمانوں کی اپنی ایک مملکت (STATE) قائم ہو چکی تھی اور جس طرح ہر مملکت کا یہ فطری حق ہے کہ اپنی حفاظت کرے اور اپنی بقائے حیات کے لئے دشمن طاقتوں سے لڑے۔ اسی طرح جب نئی اسلامی مملکت کی تباہی کا ناپاک ارادہ باندھا گیا، تو مسلمانوں نے اس کا جواب دیا۔ کبھی حدود مملکت کے اندر (جنگ احزاب) رہ کر کبھی مملکت سے باہر نکل کر (غزوۂ بدر) اور کبھی دشمن کے علاقے پر پیش قدمی کر کے (جنگ تبوک)۔ اب جوں جوں عرب کے مختلف قبائل بخوشی اسلام قبول کرتے چلے گئے اور اپنی زندگی کے رشتے مدینہ کے مرکز سے جوڑتے چلے گئے، مملکت اسلامیہ کی حدود وسعت پذیر ہوتی گئیں۔ حتیٰ کہ پورا عرب اس قلمرو کے دائرۂ عمل میں آ گیا۔ ایسا کرنا ملک عرب میں بسنے والوں کا فطری اور جائز حق تھا۔ ایک قوم یا ملک کو جو مختلف حلقوں اور حصوں میں بٹا ہو، متحد اور باہم مربوط ہو جانے اور ایک مملکت اختیار کر لینے کا حق ہمیشہ سے حاصل رہا ہے۔ جرمن قوم کی تعمیر اسی طرح ہوئی۔ یونان اور روما کی عظیم الشان سلطنتیں اسی اصول پر تشکیل ہوئیں۔ خود برطانیہ اور امریکہ اپنی تاریخ کے اوائل میں منتشر تھے لیکن جب ان میں اجتماعی شعور پیدا ہوا تو تھوڑی بہت خونریزی اور خانہ جنگی کے بعد دو زبردست وحدتیں وجود میں آئیں۔ یہی راہ عرب کے مختلف قبائل نے اختیار کی اور وہ ایک زبردست مملکت بن گئے۔

اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا

پہلے پہل یہ مملکت ایک چھوٹی سی بستی (مدینہ) تھی اور اپنے اردگرد کے قبائل اور مکہ کے کفار سے اسے خطرہ تھا۔ مگر جب مکہ اور مدینہ، طائف اور خیبر سب ایک ہو گئے تو عرب کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں پھیلی ہوئی دو عظیم شہنشاہتیں ان کو اچانک ابھرتا ہوا دیکھ کر ان کے درپے ہو گئیں

اوران کی تباہی کے منصوبے باندھنے لگیں۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے عہد میں مسلمانوں نے قیصر وکسریٰ سے جو ٹکر لی اور جہاد کیا وہ اپنی بقاء اور مملکت کے تحفظ کے فطری حق کا استعمال تھا اور اکثر انصاف پسند مؤرخین اسے تسلیم کرتے ہیں۔ مولانا شبلی، الفاروق میں ان تمام ریشہ دوانیوں کو بیان کرنے کے بعد جو مدینہ کی تباہی کے لئے رومی اور غسانی حکمران کر رہے تھے، لکھتے ہیں :-

"غرض جب حضرت ابوبکرؓ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے تو عرب کی یہ حالت تھی کہ وہ دونوں ہمسایہ سلطنتوں کا ہدف بن چکا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے شام پر لشکر کشی کی تو فوج کو مخاطب کر کے فرمایا، تھا کہ تم میں جو شخص مارا جائے گا، شہید ہوگا اور جو بچ جائے گا، مدافع عن الدّین ہوگا، یعنی دین کو اس نے دشمنوں کے حملے سے بچایا"

شہنشاہیت کا شرعی حدود سے تجاوز

ان تصریحات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ خلافت راشدہ میں جس قدر جنگی کارروائی دور و نزدیک میں ہوئی، وہ جہاد کی شرعی حدود کے اندر تھی۔ اور اسے کسی طرح ملک گیری کی ہوس یا بزور شمشیر اسلام پھیلانے کی کوشش قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن یہ خلوص نیت اور اصول پسندی زیادہ دیر تک باقی نہ رہی۔ خلافت نے بادشاہت کا رنگ اختیار کر لیا تو بادشاہت کھل کھیلنے لگی جب قوت حاصل ہو اور حدود سے تجاوز کرنے میں بظاہر کوئی امر مانع نہ ہو تو پھر بہت کم افراد اور قومیں ہوا و حرص کے جذبات پر قابو رکھ سکتی ہیں۔ شہنشاہیت نے جہاد کی نوعیت بھی بدل ڈالی۔ پہلے اسلام کی خاطر مملکت قائم ہوئی تھی، اب مملکت کی خاطر اسلام قائم کیا جانے لگا اور اس مقدّس نام کے استحصال (EXPLOITATION) کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ کسی غیر ملک پر چڑھ دوڑنے اور پُر امن بستی کو تاراج کرنے کا نام بھی جہاد قرار دیا جانے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کا یہ رکنِ رکین مذہبی اور سیاسی عصبیت کا ایک نشان بن گیا۔

تصوّرِ جہاد کے بگڑ جانے کی ایک وجہ سیاسی تھی۔ اور دوسری علمی۔ خلفائے راشدین کے سامنے لفظ قرآن حکیم تھا یا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ، لیکن اموی اور عبّاسی ادوار کے بصری تقاضوں نے جو علوم ایجاد کئے ان کی بدولت علامہ اقبال مرحوم کے الفاظ ہیں :

حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمّت روایات میں کھو گئی۔

خلافت راشدہ میں مسلمانوں کے پاس سوائے قرآن کے کچھ نہ تھا۔ لیکن عباسیوں کے عہدِ آخر تک یہ حالت ہو گئی کہ ان کے پاس سوائے قرآن کے اور سب کچھ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پس منظر ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جس کو سامنے رکھے بغیر تصوّرِ جہاد پر سے بادشاہت اور ہوسِ ملک گیری کے پردے ہٹانا ممکن نہ تھا۔ اور انجام کار اس کی وجہ سے مسلمانوں کو عظیم نقصانات اٹھانا پڑے۔

آخر میں مجھے چند الفاظ اور کہنے کی اجازت دیجئے۔ میرے اس تمام مطالعہ و تحقیق کا مقصد اپنی موجودہ نسلوں میں جہاد کے جذبۂ شوق کو کم کرنا یا جنگ کو (جب حالات کا تقاضا ہی جنگ ہو جیسا کہ گزشتہ ستمبر میں تھا۔ اور اب بھی خطرے اور اقتضا کے بادل چھٹ تو نہیں گئے) کوئی کمتر عمل ثابت کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ ہر دوسرے ضروری اور مستحسن عمل کی طرح قرآن نے 'جہاد' کے بھی کچھ حدود و آداب اور کچھ اسباب و جواز بیان فرمائے ہیں۔ اور مسلمان ہوتے ہوئے ہمارا نہایت اہم فرض ہے کہ نہ صرف ہم خود ان حدود و آداب کو واضح طور پر جانیں اور حتی المقدور اپنے عمل کو ان کا پابند بنائیں، بلکہ جب اور جہاں ان تصوّرات کے بارے میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو یا پھیلائی جائے تو ہم اس کا بھی تدارک کریں تاکہ قرآنی نظریات و تصوّرات کا چشمۂ صافی نہ خود ہمیں اور نہ غیروں کو گدلا نظر آئے۔